

بحث و نظر

سید جلال الدین عمری

صدر ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ

دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور جدید عالمی پس منظر میں

اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کے فرق اور ان کے تعلقات کی نوعیت کو واضح کرنے کیلئے ہمارے علماء و فقہاء نے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں، ان میں دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات بھی ہیں۔ یہ اپنے اندر بڑے وسیع معانی رکھتی ہیں اور ان سے اسلامی سیاست کے بعض اہم گوشوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

فقہائے کرام کے نزدیک دارالاسلام وہ ریاست ہے جہاں اسلام کے احکام علانیہ (بغیر کسی رکاوٹ) نافذ ہوں، اس سے عبادات ہی نہیں، بلکہ اجتماعی اور سیاسی احکام بھی مراد ہیں۔ اس میں بعض فقہاء نے یہ اضافہ کیا ہے کہ دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمانوں کو امن و امان حاصل ہو اور وہ بے خوف و خطر زندگی (داخلی طور پر) گزار سکیں۔ اور دارالحرب وہ ہے جہاں علانیہ احکام کفر پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی لگائی جاتی ہے کہ جہاں اہل کفر کا غلبہ ہو اور مسلمان امن و امان کی زندگی نہ بسر کر سکتے ہوں۔

دارالاسلام اور دارالحرب سے متعلق احکام بھی فقہاء نے تفصیل سے بیان کئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ دارالاسلام کی حفاظت اس کے مسلمان شہریوں کے لئے عام حالات میں فرض کفایہ ہے، لیکن بعض نازک حالات میں اس کی حیثیت فرض عین کی ہو جاتی ہے۔ اس کے دفاع کے لئے نفیر عام (یعنی امام یا سربراہ مملکت کی طرف سے جہاد کا اعلان) ہو تو ہر ایک کے لئے اس میں شرکت لازمی ہے۔ اس سے وہی افراد مستثنیٰ ہوں گے جو عذر شرعی رکھتے ہوں۔

۲۔ دارالاسلام سے بغاوت جائز نہیں ہے۔ اسے فرو کرنے کے لئے ہر ایک کو حسب استطاعت حصہ لینا ہوگا۔

۳۔ دارالحرب کے مسلمانوں کو اساسات دین پر عمل کی آزادی نہ ہو تو ان پر فرض ہے کہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جائیں۔ دارالاسلام کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوں گے۔

۴۔ دارالحرب کا کوئی غیر مسلم شہری اسلام کو جاننے اور سمجھنے کے لئے دارالاسلام آنا چاہے تو اسے اس کا مناسب

دارالاسلام اور دارالحرب کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اس کا مقصد اس حالات سے ہے۔ دار کی صرف یہی

دو شکلیں نہیں ہیں۔ اسلام ریاست کا دوسری ریاستوں سے معاہدہ امن بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ اس کا حوالہ آگے آرہا ہے۔

دورِ حاضر کے لئے دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور ہی ناقابلِ قبول ہے۔ یہ آج کے سیاسی مسلمات کے بالکل خلاف ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمات کیا ہیں اور کس حد تک مبنی برحقیقت ہیں۔ دارالاسلام اور دارالحرب کے تصور سے ان کا تصادم ہے یا نہیں اور ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب اور نظریات پر اپنا غلبہ اور تسلط چاہتا ہے۔ دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور اسی کا شاخسانہ ہے۔ آج کی دنیا کسی ایسی ریاست کو قبول نہیں کر سکتی جس کے پیش نظر دوسری ریاستوں پر اپنی بالادستی اور حکمرانی قائم کرنا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے عملی اقدامات بھی کرے۔

آج سیاست کی دنیا میں بعض باتوں پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہ اتفاق اقتدار کی کٹکٹش، اس کے نتائج اور قوموں کے کشت و خون کے طویل تجربات کے بعد ہوا ہے۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے جسے نظر انداز کرنا آج کے دور میں ممکن نہیں ہے۔ جن سیاسی امور پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ کسی ملک کا دوسرے ملک پر قبضہ نہ ہوا ہے۔ یہ ایک طرح کا نوآبادیاتی نظام ہے جو ماضی کی داستان بن چکا ہے۔ اسے زندہ کرنے کی ہر کوشش قابلِ مذمت ہے۔

۲۔ ہر ملک اپنے معاملات طے کرنے میں آزاد ہے۔ اس کے اقتدار اعلیٰ کا احترام لازم ہے اور اسے چیلنج نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ ہوگی۔

۴۔ اس پر کوئی دوسرا ملک اپنے نظریات مسلط کرنے اور اسے ان کا پابند بنانے کی کوشش نہ کرے گا۔

۵۔ کسی بھی ملک میں جو تبدیلی آئے وہ جمہوری اور آئینی طریقے سے آئی چاہیے۔ اس کے لئے جبر اور طاقت کا استعمال درست نہیں ہے۔

۶۔ مذہب فرد کا معاملہ ہے۔ اس کی بنیاد پر ریاست کے قیام کا جواز نہیں ہے۔

۷۔ دنیا کے تمام آزاد ممالک بین الاقوامی قوانین کے پابند ہوں گے۔

آئیے دیکھیں کہ ان مسلمات کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کس حد تک قابلِ عمل ہیں اور ان کی کہاں تک پابندی ہو رہی ہے؟ اور اس سلسلہ میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟

پہلے اس خیال کو لیجئے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور دوسروں پر اسلام کے غلبہ اور اقتدار کا تصور ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام غلبہ اور اقتدار چاہتا ہے۔ اس کا صاف اعلان ہے۔
© rasailojaraid.com

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الذین کله
ولو کره المشرکون (التوبہ - ۳۳)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب
کردے، چاہے یہ مشرکوں کو ناگوار ہی گزرے“

اسلام اگر اپنے اس عزم و ارادے کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دوسرے ادیان اور نظامہائے حیات پر
غالب آنا چاہتا ہے تو اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لئے کہ دنیا کا ہر نظریہ دوسرے نظریات پر غلبہ حاصل کرنا
چاہتا ہے اور اس کے لئے سعی و جہد بھی کرتا ہے۔ کیونکہ دنیا پر اپنے غلبہ کی کوشش کرتا رہا ہے۔ سرمایہ داری شب و روز
اسی تگ و دو میں ہے اور بظاہر کامیاب ہے۔ اسلام بھی ایک نظریہ حیات ہے۔ وہ غلبہ چاہتا ہے تو اسے غلط کہنے کی کوئی
معتقول بنیاد نہیں ہے۔

یہ بات کہ کسی ملک کے اقتدار اعلیٰ کو چیلنج نہیں کیا جائے گا، کوئی اصول کلیہ نہیں ہے، جو بات دیکھنے کی ہے وہ
یہ کہ اقتدار اعلیٰ صحیح اصولوں پر قائم ہے یا اس کی اساس ہی نادرست اور غلط ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہوریت اگر آمریت اور
بادشاہت کو چیلنج کرے اور ختم کرنے کی کوشش کرے تو اسے ناروا نہیں بلکہ پسندیدہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں
اسلام کا نقطہ نظریہ ہے کہ جس اقتدار کی بنیاد ظلم و زیادتی، انسانی حقوق کی پامالی اور باطل افکار اور باطل نظام پر ہے اور وہ
برضا و رغبت اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے تو اسے چیلنج کرنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس سلسلے میں اصولی
بات یہ لکھی ہے:

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق۔ (الانبیاء - ۱۸)

”بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے۔ پھر وہ ختم ہو جاتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل کان زهوقا (نہی اسرائیل: ۸۱)

”اور کہو کہ حق آیا اور باطل بھاگ کھڑا ہوا، بے شک باطل بھاگنے ہی والا ہے۔“

یہ بات کہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ ہوگی اس پر منحصر ہے کہ اس ملک کا رویہ اپنی آبادی
اور باہر کی دنیا کے ساتھ کیا ہے؟ وہ کس قسم کی اقدامات کر رہا ہے؟ اور اس کے عزائم کیا ہیں؟ اگر اس کا رویہ نوع انسانی
کے لئے خطرناک ہے تو دنیا کا فرض ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑے اور اسے اپنے عزائم کو روک دے عمل لانے اور پیش قدمی کرنے
نہ دے۔ اسلام اس میں قائل ہے کہ اگر اس کے یہاں عدل و انصاف ہے، حقوق

انسانی کی پاس داری ہے، فکر و عمل کو آزادی ہے، تو اس سے تعرض نہ کریں۔
© rasailojaraid.com

یہ اصول کہ کوئی ملک دوسرے ملک پر اپنے خیالات مسلط نہیں کرے گا بالکل درست ہے۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ خیالات کا مسلط کرنا تو بلاشبہ غلط ہے، لیکن تبادلہ خیالات غلط نہیں، بلکہ بہت ضروری ہے۔ اس سے ذہن و فکر کے درستی چکھتے ہیں اور حق و باطل واضح ہوتا ہے۔ کسی فکر کو جغرافیائی حدود کا پابند بنانا حریت فکر کے منافی ہے۔ اس وقت مغربی افکار پوری دنیا میں پھیلے جا رہے ہیں اور اس طرح پھیل رہے ہیں جیسے حق و صداقت ان ہی میں منحصر ہے۔ اسے غلط نہیں کہا جا رہا ہے، بلکہ ہر ملک پوری فراخ دلی سے ان کا استقبال کر رہا ہے۔ اسلام اپنے عقیدہ اور فکر کو مسلط کرنا نہیں چاہتا، بلکہ دلائل کے ساتھ اسے پیش کرتا اور اس پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اس نے صراحت کے ساتھ کہا ہے:

کتاب انزلنا، الیک مبارک لیدبروایاتہ ولیتذکر اولو الالباب۔ (ص: ۲۹)
ترجمہ: ”یہ کتاب ہم نے آپ پر اتاری ہے جو بابرکت ہے، تاکہ یہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل مند نصیحت حاصل کریں۔“

یہ مضمون بہت سی آیات میں بیان ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دعویٰ رسالت اور آپ کی تعلیمات کے متعلق ارشاد ہے:

اولم یتفکروا ما بصاحبہم من جنۃ ان ھو الانذیر مبین (الاعراف: ۱۸۳)
ترجمہ: ”کیا انہوں نے نہیں سوچا کہ ان کے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو صاف صاف ڈرانے والا ہے۔“
یہ ضابطہ کہ کسی بھی ملک میں جو تبدیلی آئے وہ جمہوری اور آئینی طریقے سے آئی چاہیے اس کے لئے جبر اور طاقت کا استعمال درست نہیں ہے۔ اسلام اسے صحیح قرار دیتا ہے۔ اس نے آمریت کی جگہ شورایت کی تحسین کی ہے اور اہل ایمان کا ایک اعلیٰ وصف یہ قرار دیا ہے کہ وہ اپنے معاملات مشورے سے طے کرتے ہیں: و امرہم شوریٰ بینہم (الشوری: ۳۸) خلفائے راشدین کا انتخاب اسی اصول کے تحت ہوا، تاریخ کی شہادت ہے کہ اس دور میں سب ہی اہم امور ریاست باہم مشورے سے طے ہوتے تھے۔ آج اس کی جو مناسب صورت اختیار کی جائے وہ اسلام کے خلاف نہ ہوگی، بلکہ اسے اسلام کی تائید حاصل ہوگی۔

اب مذہبی ریاست کے سوال کو لیجئے:

موجودہ دور کا یہ رجحان یا فیصلہ غیر علمی اور غیر منطقی ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ ہونا چاہیے اور مذہب کی اساس پر ریاست کی تشکیل صحیح نہیں ہے۔ یہ انسان کو مذہب سے دور رکھنے اور اسے لامذہبیت اور دہریت کے زخ پر ڈالنے کی کوشش ہے۔ اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کے سامنے یہ وسیع کائنات ہے، جس میں وہ سانس لے رہا اور زندگی گزار رہا ہے اور خود اس کا وجود اور اس کی ذات ہے۔ ان کے بارے میں بعض غلط سوالات ابھرتے ہیں۔ ان

سوالات کا تعلق عقیدہ، فکر، عبادت، اطاعت، اخلاق و سیرت، تہذیب و معاشرت، معیشت و سیاست اور زندگی کے ہر گوشے سے ہے۔ وہ ان کا متعین جواب چاہتا ہے۔ ان کا ایک جواب سیکولر نظریات دیتے ہیں۔ دوسرا جواب اسلام دیتا ہے۔ اگر سیکولر نظریات قابل غور ہو سکتے ہیں تو اسلامی فکر کیوں قابل غور نہ ہو؟ اسے محض اس وجہ سے رد کر دینا کہ وہ ایک مذہب ہے (حالانکہ اسلام عام معنی میں مذہب نہیں، ایک فلسفہء حیات ہے) خدا اور ہٹ دھرمی یا ذہنی تعصب کی دلیل ہے۔ کوئی بھی غیر جانب دار شخص اس کی تائید نہیں کر سکتا۔

بین الاقوامی معاہدوں کے احترام اور ان کی پابندی کی تعلیم شاید سب سے پہلے اسلام ہی نے دی ہے۔ اس نے تاکید کے ساتھ کہا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ (المائدہ: ۱)

ترجمہ: ”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، معاہدوں کو پورا کرو۔“

آیت میں ’عقود‘ کا لفظ آیا ہے اس میں جس طرح اللہ اور بندے کے درمیان ہونے والے عہد و پیمان شامل ہیں اسی طرح وہ عہد و پیمان بھی اس میں آتے ہیں جو افراد اور جماعتوں کے درمیان ہوں۔

بین الاقوامی معاہدوں کے سلسلہ میں اسلام نے بعض اصول ہدایات دی ہیں۔

۱۔ عہد و پیمان جنگ بندی اور امن و امان کیلئے ہو تو اللہ تعالیٰ کے بھرپور پر بے خوف و خطر قبول کر لینا چاہیے۔

وَإِنْ جُنْحُوا لِلْسِّمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

یُرِيدُ أَنْ يَمْلِكَ فَرَأَى حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي يُدْعَىٰ بِالنِّعَمِ ۝

(الانفال: ۶۱-۶۲) ”اگر وہ امن و صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔

بے شک وہ سننے اور جاننے والا ہے۔ اگر وہ تمہیں دھوکہ دینا چاہیے تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ اس نے (اس سے

پہلے) تمہیں اپنی نصرت اور اہل ایمان کے ذریعہ تقویت پہنچائی ہے (وہ اب بھی تمہیں طاقت عطا کرے گا)

۲۔ فریق ثانی جب تک عہد شکنی نہ کرے، عہد کی لازم پابندی کی جائے۔ مشرکین قریش کے بارے میں قرآن

نے کہا کہ ان سے عہد و پیمان پورا کرنے کی توقع نہیں ہے۔ اس کے باوجود حکم ہوا۔

فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يَحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ (التوبة: ۷)

”پس جب تک وہ سیدھے طریقے سے اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھا طریقہ اختیار کرو

(عہد کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو) بے شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔

۳۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہو تو اسے ختم کیا جاسکتا ہے، لیکن فریق ثانی کو دھوکے میں نہ رکھا جائے، بلکہ

علی الاعلان اسے ختم کیا جائے۔ © rasailojaraid.com

و اما تخافن من قوم خيانه فانبذ اليهم على سواء ان الله لا يحب

الخائنين ۵ (الانفال: ۵۸)

ترجمہ: ”اگر تمہیں کسی قوم کے عہد و پیمان میں خیانت (بدعہدی) کا خوف ہو تو اسے اس طرح پھینک دو کہ تم اور وہ برابر کی حیثیت میں آجائیں (دونوں پر واضح ہو جائے کہ اب معاہدہ ختم ہو گیا ہے۔ خیانت نہ کرو) بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔“

بین الاقوامی معاہدوں کے سلسلے میں اس سے زیادہ معقول اور امن پسندانہ رویہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے تصور پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے بیش تر موجودہ دور کے طرز عمل پر وارد ہوتے ہیں وہ جس رویہ کو اپنے لئے جائز قرار دیتا ہے اسے دوسروں کیلئے جائز نہیں سمجھتا۔ ان اعتراضات سے قطع نظر اس پورے موضوع پر موجودہ حالات میں بعض اور پہلوؤں سے غور و فکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ (فداہ انبی و امی) نے جن حالات میں سردارانِ قبائل سے خطاب فرمایا تھا یا جو مکاتیب غیر اسلامی ریاستوں کے سربراہوں کے نام ارسال فرمائے تھے انہیں پیش نظر رکھنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس وقت کے حالات اور آج کے حالات میں کیا فرق واقع ہوا ہے؟

۱۔ وہ دور شہنشاہیت اور آمریت کا تھا۔ بادشاہ وقت اقتدار کا مرکز اور آمر مطلق ہوتا۔ وہ اپنے وزراء و اعیان اور حوالی موالی کی مدد سے جس طرح چاہتا حکومت کرتا۔ وہ نہ تو خود کو کسی کے سامنے جواب دہ سمجھتا اور نہ کسی کو اس سے باز پرس کی ہمت ہوتی۔ عوام حقیقی معنی میں کالانعام اس کے احکام کی تابع داری کرتے، امور ریاست میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوتا، سردارانِ قبائل اور مطلق العنان آمروں کا بھی یہی طریقہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اسی وجہ سے سردارانِ قبائل اور بادشاہانِ وقت سے خطاب کیا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ اس لئے کہ ان کے اسلام قبول کرنے کے معنی عوام کے اسلام قبول کرنے کے تھے اور ان کا رد کر دینا عوام کے رد کر دینے کے مترادف تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے شاہِ روم ہرقل کو جو خط روانہ کیا اس میں آپؐ نے فرمایا:

أَسْلَمْتُ، تَسْلِمُ، أَسْلَمَ يُؤْتِكُ اللَّهُ أَجْرَكَ مَرْتِينَ وَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَبِئْسَ عَلَيْكَ إِثْمٌ

الْأَرِمِينِ (مسلم کتاب الجہاد)

ترجمہ: ”اسلام لاؤ سلامتی سے رہو گے۔ اسلام لاؤ اللہ تمہیں دُگنا اجر عطا کرے گا۔ اگر تم نے اس سے بے رخی

برتی تو تم پر کسانوں (رعایا) کا بھی گناہ ہوگا۔“

بادشاہ اگر انکار کر دے تو رعایا کا گناہ بھی اس پر اس لئے عائد ہوگا کہ وہ دین و مذہب اور عقیدہ و فکر میں اس کے تابع تھے۔ وہ اسلام قبول کر لے تو رعایا بھی لازماً اسلام قبول کر لے گی۔ وہ اگر رد کر دے تو رعایا بھی اسے رد کر دے دے گی۔ (۳)

عصر جدید نے صورت حال بدل دی ہے۔ قبائلی حکمرانی اور بادشاہت اور آمریت کا دور بڑی حد تک قصہ پارینہ بن چکا ہے یا بنتا جا رہا ہے۔ یہ دور عوام کے اقتدار کا ہے۔ اس لئے اب اسلام کا خطاب بھی کسی مخصوص فرد یا طبقے تک محدود نہ ہوگا اور ان کا فیصلہ عوامی فیصلہ نہیں کہلائے گا۔ خاص طور پر جہاں عقیدے اور فکر اور نظام سیاست میں بنیادی اور دور رس نتائج کی حامل تبدیلی کا سوال ہو۔ اس کے لئے اس ملک کے عوام سے خطاب کرنا ہوگا۔ کسی اونچے سے اونچے فرد یا گروہ سے خطاب کے ذریعہ پوری قوم پر دعوتی حجت پوری نہ ہوگی اور اس کے خلاف طاقت کے استعمال کا غالباً جواز نہ ہوگا۔

۲۔ عہد رسالت اور اس سے قریب کے دور میں ایک طرف دارالاسلام یا اسلامی ریاست تھی جہاں اسلام اپنے عقیدے اور فکر، اپنے پورے وجود سے اسلام کی ترجمانی کر رہا تھا۔ دوسری طرف غیر اسلامی ریاستیں یا بہت سے دارالحرب تھے جہاں احکام کفر نافذ تھے۔ دونوں کا فرق آسانی سے سمجھا جاسکتا تھا۔ اب کوئی دارالاسلام نہیں ہے۔ بہت سے مسلم ممالک ہیں جن میں سے کسی ملک میں اسلام کی حکمرانی صرف عبادات اور شخصی امور تک محدود ہے اور کہیں نسبتاً اس سے وسیع دائرے میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اسلام کا نفاذ پوری تفصیلات کے ساتھ کہیں نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ان میں سے ہر ملک اپنی جگہ خود مختار اور اپنی سیاسی پالیسی اور حکمت عملی میں آزاد ہے۔ ان کا کوئی مشترکہ دفاق بھی نہیں ہے جو غیر اسلامی ریاستوں کے سامنے اسلام کے تقاضے اور مطالبات رکھ سکے۔

۳۔ اس وقت دارالاسلام وقت کی ایک غالب قوت تھا اور وہ دوسری ریاستوں سے اپنی شرائط پر بات کر سکتا تھا، لیکن آج کوئی اسلامی ریاست اس موقف میں نہیں ہے بلکہ وہ دوسری طاقتوں کے زیر اثر ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب کے جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ اپنے وقت میں قابل عمل تھے اور ان پر عمل ہو بھی سکتا تھا لیکن موجودہ بین الاقوامی حالات ان میں سے بعض احکام پر مزید غور و فکر کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہاں ان کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ دارالحرب میں اگر اسلام کے اظہار اور اس پر عمل کی آزادی نہ ہو تو وہاں کے مسلمانوں پر دارالاسلام ہجرت کر جانا فرض ہے۔ لیکن اب یہ صورت حال غالباً صرف بعض کمیونسٹ ممالک میں رہ گئی ہے۔ اس سے قطع نظر غور طلب امر یہ ہے کہ ہجرت کے لئے دارالاسلام کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے دروازے مہاجرین کے لئے کھلے ہوں۔ مسئلہ دوچار افراد کا نہیں بلکہ اس طرح کے ممالک میں موجود پوری امت کا ہے۔ اس کے لئے کیا آج

کوئی دارالاسلام یا مسلم ملک تیار ہے؟

۲۔ جہاں تک غیر مسلم جمہوری ممالک کا تعلق ہے ان میں تمام باشندگان ملک کے مساوی حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان کسی طرح کے فرق و امتیاز کو صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ ان ممالک میں مسلمان ان تمام سیاسی حقوق کے ساتھ رہ رہے ہیں جو غیر مسلم شہریوں کو حاصل ہیں۔ وہ مذہب کی آزادی کا بھی حق رکھتے ہیں۔ از روئے قانون انہیں اسلام کے اظہار و اعلان اور اسلامی عبادات پر عمل کی۔ اس کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح وہ اسلام کے معاشرتی قوانین نکاح، طلاق، وراثت، ہبہ، وصیت وغیرہ پر عمل کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں ان کے لئے ہجرت کا حکم نہیں ہے بلکہ وہاں قیام پسندیدہ ہے تاکہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے فروغ کی وہ کوشش کر سکیں۔

۳۔ حربی کے، دارالاسلام میں قیام کا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ موجودہ دور میں ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان آمد و رفت کے کچھ قاعدے ضابطے مقرر ہیں۔ یہ سب کیلئے ہیں۔ ان ہی کے تحت لوگ تعلیم، ملازمت، تجارت، سیاحت، ایک دوسرے سے تعلقات پیدا کرنے، بڑھانے اور خیر گالی جیسے مقاصد کے لئے بیرونی ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ حالات کے لحاظ سے انہیں مختصر یا طویل مدت تک قیام کی اجازت ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک ملک کا شہری دوسرے ملک کی شہریت وہاں کی سہولتوں اور آسائشوں کے پیش نظر اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی اس میں مجبوری کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا یا مسلم ملک اور غیر مسلم ملک کا بھی فرق نہیں ہے۔ مسلم ممالک کے شہری بھی غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کر لیتے ہیں اور وہیں رہ بس جاتے ہیں؟ کیا اسے دارالاسلام سے دارالحرب کی طرف ہجرت کہا جائے گا؟ یا کم از کم اسے غیر اسلامی قرار دیا جائے گا؟

فقہائے کرام نے اپنے دور کے حالات میں جو احکام بیان کئے ہیں ان میں آج اس طرح کی دشواریاں پائی جاتی ہیں ان پر اس پہلو سے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ کتاب و سنت کا منشا کیا ہے اور وہ کس طرح پورا ہو سکتا ہے؟ دارالاسلام اور دارالحرب سے متعلق جو اہم سوال ابھرتا ہے، جس کا ان کے تعلقات پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اور جو بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے، وہ یہ ہے کہ کیا دارالاسلام آج کے دور میں دارالحرب سے اسلام قبول کرنے یا جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کرے گا اور یہ مطالبہ تسلیم نہ ہو تو اس کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا؟ کیا یہ صریح جارحانہ رویہ نہیں ہے؟ کیا یہ کسی ملک کی آزادی کو سلب کرنے کی عریاں جدوجہد نہیں ہے؟ کیا دنیا کا کوئی بھی ملک اسے قبول کر سکتا ہے اور بین الاقوامی قوانین اس کی اجازت دیں گے؟

یہ سوال بڑا بھیانک ہے اور بہ ظاہر اسلام کے موقف کو حق بہ جانب قرار دینا آسان نہیں ہے، لیکن یہ سوال اسلام کے موقف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے

۱۔ دارالاسلام یا اسلامی ریاست کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کو اللہ کے نازل کردہ واحد دین حق کی حیثیت پیش کرے اور اسے قبول کرنے کی دعوت دے۔ یہ دعوت اسی وقت قابل توجہ اور قابل قبول ہو سکتی ہے جب کہ اسے محض ایک دعویٰ کے طور پر ہی نہ پیش کیا جائے، بلکہ دلائل کے ذریعہ دوسرے ادیان اور نظریات کے مقابلہ میں اس کا برحق ہونا ثابت کیا جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ اسی میں دنیا اور آخرت کی فلاح مضمر ہے۔ اور یہی کامیابی و کامرانی کا واحد راستہ ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ مخاطب قوم اسلام کو قبول کر رہی ہے یا اس نے اسے رد کر دیا ہے۔

اللہ کا دین بے شک دوسرے ادیان پر غالب آنا چاہتا ہے، لیکن یہ غلبہ محض سیاسی نہیں، بلکہ دلائل و براہین کا غلبہ بھی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دلائل و براہین کا غلبہ ہی حقیقی معنی میں سیاسی غلبہ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون بھی یہی ہے۔ اس کے رسول اپنی قوم کے درمیان دلائل کے ذریعہ اسلام کا برحق ہونا ثابت کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود جب وہ انکار کرتی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے، اس سے پہلے نہیں آتا۔

وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا۔ (بنی اسرائیل: ۱۵)

”ہم کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔“

فقہاء کے درمیان یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اسلام کی دعوت کے بغیر کسی قوم کے خلاف فوجی اقدام نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ دونوں طرف کی فوجیں محاذ جنگ پر ایک دوسرے کے بالمقابل صف آراء ہوں تب بھی حملہ سے پہلے اسلام کی دعوت ضروری ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دعوت دلائل کے ساتھ ہونی چاہیے۔

۲۔ اسلام اس امر کے خلاف ہے کہ اس کی تعلیمات پر سنجیدگی سے غور و فکر کی جگہ انہیں مذاق کا موضوع بنالیا جائے، ان کی تصویر مخ کی جائے، ان پر بے بنیاد اعتراضات کئے جائیں، ان کے بارے میں خواہ مخواہ شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں اور دوسروں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہی بات آیات ذیل میں بیان ہوئی ہے اور اس پر آخرت کی وعید سنائی گئی ہے۔

..... وويل للكافرين من عذاب شديد ۝ الذين يستحبون الحياة

الدنيا على الآخرة ويصدون عن سبيل الله ويغونها عوجاً ۝ أولئك في ضلال

بعید ۝

ترجمہ: ”اور بتائی ہے کافروں کے لئے ایک سخت عذاب کی۔ وہ جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ یہ لوگ گمراہی میں بہت دور جا چکے ہیں۔“

..... الا لعنة الله على الظالمين ۝ الذين يصدون عن سبيل الله و
يبغونها عوجاً ۝ وهم بالآخرة هم كفرون ۝ (ہود: ۱۸-۱۹)
ترجمہ: ”سن لوالہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔ وہ جو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں
اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں۔“

۳۔ اسلام جبر و اکراہ کا قائل نہیں ہے۔ وہ عقیدے اور مذہب کی آزادی کو انسان کا بنیادی حق سمجھتا
ہے وہ چاہتا ہے کہ خود اس کے سلسلے میں بھی یہ آزادی حاصل رہے۔ جو شخص اسے اختیار کرے اسے لالچ، خوف، زور اور
طاقت کے ذریعہ منحرف کرنے کی کوشش نہ کی جائے اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ نہ توڑے جائیں اور اس کے چاروں طرف
حصار جبر نہ کھڑا کر دیا جائے۔ اس ظالمانہ رویہ کے لئے وہ ”فتنہ“ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ جو فر دیا گروہ کسی کے
خلاف یہ رویہ اختیار کرے اس کے نزدیک وہ بدترین جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔

قتل اصحاب الاخذود ۝ النار ذات الوقود ۝ اذ هم عليها قعود ۝ وهم على
ما يفعلون بالمؤمنين شهود ۝ وما نقموا منهم الا ان يؤمنوا بالله العزيز
الحميد ۝ الذي له ملك السموت والارض ۝ والله على كل شئ شهيد ۝ ان
الذين فتنوا المؤمنين والمؤمنات ثم لم يتوبوا فلهم عذاب جهنم ولهم عذاب
الحريق ۝ (البقرة: ۱۰-۱۱)

ترجمہ: ”مارڈا لے گئے کھائیوں والے جن میں ایندھن کی آگ تھی اور وہ ان کے کنارے بیٹھے تھے اور اہل ایمان
کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ان سے صرف اس لئے بدلہ لیا کہ وہ اللہ پر جو غالب اور
ستودہ صفات ہے ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اللہ جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا
ہے۔ جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں کو دین سے پھیرنے کی کوشش کی اور سزائیں دیں پھر توبہ نہیں کی تو ان کے
لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے دہکتی آگ کا عذاب ہے۔“

جس ملک میں بھی جبر و اکراہ کی صورت حال ہو دارالاسلام اسے ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لئے وہ
طاقت بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اشہر حرم میں جہاد پر اعتراض تھا۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا۔

يسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه ۝ قل قتال فيه كبير ۝ وصد عن سبيل
الله و كفر به والمسجد الحرام واخراج اهله منه اكبر عند الله والفتنة اكبر من
القتل (البقرہ: ۲۱۷)

ترجمہ: ”وہ تم سے محترم ہے جہاد پر اعتراض تھا۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا۔

کے راستے سے روکنا، اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے باز رکھنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکال دینا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ فتنہ قتل سے بھی بڑا ہے۔“

اسی بنیاد پر مکہ جو اس وقت دارالحرب تھا، اس کے کمزور اور بے بس مسلمانوں کو جو ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے، جنہیں قرآن نے مستضعفین کہا ہے وہاں سے نکالنے کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا۔ (النساء: ۷۵)

دارالحرب میں دعوت و تبلیغ کے مواقع حاصل ہوں، اسلام کی راہ میں دستوری اور عملی رکاوٹ نہ ہو اور آزادی سے اسے اختیار کیا اور اس کی تعلیمات کے مطابق عمل کیا جاسکے تو توقع ہے کہ خود وہاں اندر سے اسلام ابھرے گا۔ اس کے لئے اسے جنگ کی ضرورت نہ ہوگی۔

دنیا کی ہر ریاست کی طرح دارالاسلام کو بھی اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ اگر دارالحرب کی طرف سے وہ خطرہ محسوس کرے تو دفاعی اقدامات ضرور کرے گا۔ موجودہ دور میں بین الاقوامی معاہدے موجود ہیں جو ایک ملک کو دوسرے ملک پر حملہ سے روکتے ہیں۔ اس طرح کا معاہدہ دارالاسلام بھی کر سکتا ہے۔

﴿ مراجع و حواشی ﴾

- ۱۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب تأمیر الامام الامراء علی البعث الخ۔ ابو داؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب فی دعاء المشرکین
- ۲۔ بخاری، کتاب الجزیہ والموادع، باب الجزیہ والموادع الخ۔
- ۳۔ امام نووی فرماتے ہیں: معناه ان علیک اثم رعایاک الذین یتبعونک ویتقادیون بانقیادک ونبہ بھولاء علی جمیع الرعایا، لأنھم الأغلب ولا ینھم اسرع انقیاداً، فانذا أسلم اسلموا و اذا امتنع امتنعوا وهذا القول هو الصحيح (شرح مسلم، جلد ۶، جز ۱، ص ۹۳، دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ تم پر تمہاری رعایا کا بھی گناہ ہوگا، جو تمہارا اتباع کرتے ہیں اور تمہارے اطاعت قبول کرنے سے خود بھی مطیع ہو جائیں گے۔ اریسین (کاشت کاروں) سے تمام رعایا کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس لئے کہ ان ہی کی اکثریت تھی اور سب سے بڑھ کر اطاعت رٹا لے بھی وہی تھے۔ اگر بادشاہ اسلام لے آئے تو وہ بھی اسلام لے آئیں گے اور وہ اس سے باز رہے تو وہ بھی باز رہیں گے۔

نوٹ: آپ اپنے مضامین مدبر الحق کو بذریعہ ای میل بھیج سکتے ہیں